میاں نذیر حسین محدث دہلویؒ۔حیات وعلمی نقوش

Miān Naẓīr Ḥussain Moḥaddith Dahelvī: Life & Literary Services

Dr. Hafiz Abdul Basit Aziz
Principal
Govt. High School, Orara, Kasur

Dr. Hafiz Abdul Basit Khan
Assistant Professor
Sheikh Zayed Islamic Centre, University of Punjab, Lahore

ABSTRACT

Miān Naẓīr Ḥussain Dahelvī is one of the 'Ulama' of Sub-continent who has spent his whole life for promotion of the religion of Islām, particularly in the field of ḥadith and its sciences. His services are not just recognized in the reign of sub-continent but all over the Muslim World. He was one of the Muslim scholars, who has taught Islām to his students and preached his followers. There are many students, learned from him in the field of ḥadith sciences particulary, the tentative number is around twenty thousand and the number of his followers is almost in milions. Miān Naẓīr Ḥussain Dahelvī has served as a teacher in the city of Dehlī for almost seven decades. It is possible to have a diverse opinion and interpretation from his views but his services for Islām and Muslim Ummah are accepted all over the Muslim World. He is considered the real successor of Shah Walī ullahī in the field of ḥadith and its sciences. He has authoured many books, manuscripts about Islām, generally and ḥadith sciences particularly. The present article discusses several aspects of his life as well as his services to Islām generally and particularly in the field of ḥadith and its sciences.

Keywords: *Islām, Ḥadith, Shah Walī ullahī, Muslim World, Muslim Scholar.*

سورۃ الحجر میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ[1] (یقیناً ہم نے ہی ذکر نازل کیا ہے اور ہم خود ہی اس کی نگہبانی کرنے والے ہیں)

اللہ تعالیٰ نے اپنا یہ وعدہ اس طرح پورا فرمایا کہ ہر صدی میں کچھ ایسی مثالی شخصیتیں پیدا فرماتا رہا کہ جنہوں نے زندگی کا اوڑھنا بچھونا ہی دین

اسلام کی ترویج واشاعت کو بنائے رکھا،اور یوں ان اساطین علم کی گراں قدر خدمات سے اسلام دنیا کے ہر خطے میں پہنچ گیا۔انہی اولوالعزم ہستیوں میں سے ایک ہستی شیخ الکل میاں نذیر حسین دہلویؒ ہیں جنہوں نے ہندوستان کے شہر دہلی میں بساط علم بچھائی اور تقریباً سات دہائیوں تک ہزاروں طالبانِ علم نے آپ سے کسبِ فیض کیا۔آئندہ سطور میں اسی شخصیت کی پیدائش سے لے کر وفات تک کے حالات و واقعات کا جائزہ لیا جائے گا۔

ولادت وسلسلہ نسب

حضرت میاں صاحب کی ولادت ۱۲۲۰ھ (۱۸۰۵ء) میں موضع بلتھوا میں ہوئی جو ہندوستان کے صوبہ بہار کے ضلع مونگیر میں واقع ہے۔حضرتؒ کا سلسلہ نسب چوتنیسویں پشت میں بواسطہ حضرت حسینؓ، حضرت علیؓ سے اور پینتیسویں پشت میں بواسطہ حضرت فاطمۃ الزہراؓ رسول اللہ ﷺ سے ملتا ہے۔حضرت میاں صاحب ننیہال اور دادیہال کی طرف سے نقوی حسینی سید ہیں۔آپ کے والد کا اسم گرامی سید جواد علی تھا جو فارسی زبان میں بالخصوص مہارت رکھتے تھے۔[2]

پورا نسب نامہ یہ ہے۔سید محمد نذیر بن سید جواد علی بن سید عظمت اللہ بن سید الہ بخش بن سید محمد بن سید ماہرو بن سید محبوب بن سید قطب الدین بن سید ہاشم بن سید چاند بن سید معروف بن سید بدھن بن سید یونس الحاج بن سید بزرگ بن سید زیرک بن سید رکن الدین بن سید جمال الدین بن سید احمد بن سید محمد بن سید داؤد بن سید افضل بن سید فضیل بن سید ابوالفرح بن سید امام حسن عسکری بن امام نقی بن امام محمد تقی بن امام موسی رضا بن امام موسیٰ کاظم بن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر بن امام زین العابدین بن امام حسین بن علی رضی اللہ عنہما۔[3]

ابتدائی دور

ہم میاں صاحب کے عہد طفولیت پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اس دور میں ان کا اصل مشغلہ کھیل کود، گھڑ سواری، جمناسٹک، دریا میں شناوری اور بھاگ دوڑ تھا۔یہی وجہ ہے کہ ان کی صحت بہت اچھی تھی، قویٰ مضبوط تھے۔جفاکشی، محنت، زندہ دلی، دوسروں کی خدمت اور صبر وضبط وغیرہ امور ان کے لوازم حیات قرار پاگئے تھے۔پڑھنے لکھنے کی طرف کوئی دھیان نہ تھا۔پندرہ سولہ سال کا ابتدائی زمانہ اسی طرح گزر گیا۔[4]

اب سوال یہ ہے کہ تحصیل علم کی طرف کیوں میلان ہوا اور کب ہوا۔۔۔؟

برہمن کی ترغیب

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ میاں صاحب کے والد کی خدمت میں ایک پڑھا لکھا برہمن آیا کرتا تھا۔ایک دن اس نے میاں صاحب سے کہا:

''میاں صاحب زادے؟ تم اتنے بڑے ہو گئے ہو اور پڑھنے لکھنے سے محروم ہو۔تمہیں پتا نہیں کہ تمہارے خاندان کے تمام لوگ مولوی ہیں اور تم جاہل ہو۔''[5]

حصول علم کا شوق اور ابتدائی تعلیم

برہمن کی اس مختصر اور سیدھی بات نے دل پر اتنا اثر کیا کہ اسی آن دل طلب علم کی طرف مائل ہو گیا اور اس جذبے میں اس قدر تیزی آئی کہ پہلی تمام حرکات سے دست کش ہو گئے اور حصول تعلیم کے شوق نے ذہن پر پوری طرح قبضہ کر لیا۔پہلے والد ماجد سے فارسی پڑھی جنہیں اس علم میں مہارت حاصل تھی۔تھوڑے عرصے میں یہ مرحلہ طے ہو گیا تو عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھنا شروع کر

دیں۔اس وقت وہ عمر عزیز کے سولھویں سال سے نکل کر سترھویں سال میں قدم رکھ رہے تھے اور پڑھنے کے شوق میں لحہ بہ لحہ اضافہ ہو رہا تھا اور کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس شوق کی تکمیل کے لئے کیا صورت اختیار کی جائے۔[6]

''مدینۃالعلم''میں شاہ محمد حسین سے تحصیل علم (تعلیم کیلئے پہلا سفر)

اسی اثنا میں رازداری کے وعدے پر اپنے ایک ہم عمر طالب علم بشیر الدین عرف امداد علی سے مشورہ کیا تو پتا چلا کہ اس کی قلبی کیفیت بھی یہی ہے۔چند روز کے بعد موقع پا کر رات کے اندھیرے میں دونوں گھر سے نکلے اور کسی طرح عظیم آباد (پٹنہ) جا پہنچے۔اس شہر کو اس زمانے میں مدینۃ العلم کی حیثیت حاصل تھی۔وہاں کے محلہ ننوہیاں میں شاہ محمد حسین کے مکان پر ٹھہرے، جہاں طلباء کی تعلیم اور ان کی ضروریات کی کفالت کا بہت اچھا انتظام تھا۔طلباء اچھی خاصی تعداد میں ہر وقت وہاں تحصیل علم میں مصروف رہتے تھے۔میاں صاحب اور ان کے ساتھی بشیر الدین عرف امداد علی ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۱ء) میں وہاں پہنچے تھے۔میاں صاحب کم و بیش چھ مہینے وہاں اقامت گزیں رہے۔اس عرصے میں انہوں نے وہاں کے اساتذہ سے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا اور کتب حدیث میں مشکوۃ شریف پڑھی۔[7]

سفر دہلی اور راستے میں مختلف شہروں سے تحصیل علم

اس وقت حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ زندہ تھے اور دہلی میں تشریف فرما تھے۔نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام اسلامی ممالک میں ان کی فضیلتِ علمی کا شہرہ تھا اور ہر جگہ ان کے فیض یافتگان موجود تھے۔میاں صاحب کا عازم دہلی ہونے کا اصل مقصد حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے حضور زانوے شاگردی تہ کرنا تھا۔بہر حال ۱۲۳۷ھ (۱۸۲۲ء) میں میاں صاحب اپنے رفیق سفر امداد علی کی رفاقت میں دہلی کے لئے پٹنہ سے روانہ ہوئے۔وہاں سے چل کر غازی پور پہنچے تو چند روز وہاں قیام کیا اور مولوی احمد علی چڑیا کوٹی سے ابتدائی درسی کتابیں پڑھیں۔مولوی احمد علی کا شمار اس عہد کے مشاہیر علما میں ہوتا تھا۔غازی پور سے بنارس کا عزم کیا۔وہاں بھی کچھ مدت قیام رہا۔بنارس میں نو روپے میں ایک کتاب فروخت کی اور آئندہ سفر کے لئے ایک گھوڑا خریدا۔بنارس سے الٰہ آباد کو روانہ ہوئے۔الٰہ آباد میں دریائے جمنا کے کنارے ایک مسجد میں قیام کیا۔اس مسجد میں چند روزہ قیام کے بعد دائرہ شاہ محمد اجمل میں فروکش ہوئے۔وہاں مولوی زین العابدین کا سلسلہ درس جاری تھا، میاں صاحب نے صرف و نحو کی کتابیں جن میں مراح الارواح، زنجانی، نقود الصرف، شرح مائۃ عامل، مصباح، ضریری اور ہدایۃ النحو وغیرہ شامل ہیں، وہیں الٰہ آباد کے دوران قیام میں پڑھیں۔پھر حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے مستفید ہونے کی نیت سے الٰہ آباد سے دہلی کو روانہ ہوئے۔وہاں سے چل کر موضع ''کوڑا'' پہنچے جو اعمالِ ضلع فتح پور میں واقع ہے۔چلتے پھرتے ضلع کان پور میں وارد ہوئے۔پھر ضلع فرخ آباد کا رخ کر لیا۔غرض اس طرح اِدھر اُدھر ہوتے ہواتے دوبارہ ضلع کان پور چلے گئے اور موضع خواجہ پھول (تھانہ سکندرہ، تحصیل بھوگنی پور) کے قلعے کے اندر آبادی میں قیام فرمایا۔وہاں ایک بزرگ خواجہ پھول کا مزار ہے۔اس کے قریب والی مسجد میں میاں صاحب ٹھہرے اور جانب جنوب کی دیوار کی جھنجریوں پر اپنے دستخط سے یہ الفاظ تحریر فرمائے،

''بندہ فقیر امروز وارد مسجد ہذا شد۔عبدہ سید محمد نذیر حسین سورج گڑھی۔المرقوم فی التاریخ پنجم ماہ رجب المرجب ۱۲۳۸ ہجری۔''

میاں صاحب کے ملنے والے ایک صاحب جناب سید عبدالعزیز (ساکن صمدن ضلع فرخ آباد) تھے۔کسی زمانے میں وہ تحصیل دار ہو کر بھوگنی پور گئے تو مذکورہ بالا تحریر ان کی نظر سے گزری اور اس کی اطلاع انھوں نے میاں صاحب کو دی۔میاں صاحب نے ان کو جواب میں لکھا کہ

''میں بھی ایامِ طلب علم میں کوڑا ہو کر تمہارے اسی علاقے سے گزرا تھا۔ تم نے لکھا ہے کہ ''موضع خواجہ پھول کے قلعہ کی مسجد میں کوئی یادداشت ورودِ فقیر کی بقلم تحریر ہے،'' بے شک ہو گی۔ ذرا اس کو کسی وقت پڑھ کر نقل کر لینا جس سے ماہ و سن وغیرہ دریافت کر لینے سے تم کو انتباہ ہو گا۔ میں ایک گھوڑے پر تھا۔ ایک طالب علم بھی میرے ساتھ تھے۔ شوقِ کتاب بینی اس وقت زیادہ تھا اور تمہاری طرح غصہ وری اور جلد بازی بھی مجھ میں زیادہ تھی۔ اب کیا ہے۔ فقیر ٹھنڈا ہو گیا۔ تم بھی زیادہ عمر پاؤ گے، عیال کا بوجھ زیادہ ہو گا، سب این و آن طاق پر رکھی رہ جائے گی۔''[8]

دہلی میں آمد اور تحصیل علم میں مشغولیت

غرض اس علاقے سے رخصت ہو کر حضرت میاں صاحب آہستہ آہستہ سفر کرتے اور مختلف مقامات میں قیام کرتے ہوئے ۱۳ رجب ۱۲۴۳ھ مطابق ۰۳- جنوری ۱۸۲۸ء کو بدھ کے دن دہلی پہنچے۔[9]

حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے بعد مسند درس پر ان کے لائق ترین نواسے حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب متمکن تھے، جن کے حلقہ درسِ حدیث کو تمام ہندوستان کے شائقین حدیث کے مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ میاں صاحب بھی علوم رسمیہ سے فراغت کے بعد علوم تفسیر و حدیث اور فقہ کی تحصیل کے لئے حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کے مرکز حدیث کا رخ کیا۔ حضرت شاہ صاحب ممدوح سے میاں صاحب نے صحاح ستہ کی تکمیل کی، نیز تفسیر جلالین، تفسیر بیضاوی، کنزالعمال اور حافظ سیوطی کی جامع صغیر کا درس لیا۔ علاوہ ازیں تیرہ برس کی مدت مدید تک ان کی صحبت بابرکت سے مستفیض ہوتے رہے۔ صحیح بخاری و صحیح مسلم پڑھنے کا طریقہ یہ تھا کہ ایک دن پہلے شام کو مولوی برکت اللہ بیگ کے ساتھ مولانا عبدالخالق صاحب سے وہی سبق پڑھ لیتے تھے جو کل صبح کو حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کے حلقہ درس میں آنے والا تھا، اس طرح وہ صبح کو حضرت شاہ صاحب کے درس میں شریک ہو کر اس کی سماعت کرتے اور اگر کوئی مسئلہ حل طلب ہوتا تو صبح کے درس میں شاہ صاحب سے سوال کرتے اور مسئلہ حل ہو جاتا یعنی کہیں کوئی شبہ پیدا ہوتا تو رفع ہو جاتا۔ مولانا عبدالخالقؒ کے حضور قرات کرتے اور حضرت شاہ صاحب کی جناب میں سماعت فرماتے، شاہ صاحب کے درس میں ان کو قرات کا اتفاق کم ہوا اور سماعت کا زیادہ، اسی لئے حضرت شاہ صاحب نے ان کی سند میں تحریر فرمایا ہے کہ سَمِعَ مِنّی الاحادیث الکثیرۃ (یہ پوری سند آگے درج کی جائے گی) بہ الفاظ دیگر حضرت میاں صاحب کو صحیح بخاری اور مسلم پڑھنے کا شرف مولانا عبدالخالقؒ صاحب سے بھی ہوا اور حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب سے بھی، اوّل الذکر سے قراتاً اور ثانی الذکر سے سماعاً۔[10]

شاہ محمد اسحاقؒ صاحب نے ۱۲۵۸ھ میں ہجرت کی اور اسی سال بہ وقت رخصت شیخ الکل میاں صاحب کو ان سے سند و اجازہ حدیث کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ شاہ صاحب بہ قصد ہجرت دہلی سے رخصت ہوئے تو ان کی پہلی منزل نظام الدین میں تھی۔ تین روز وہاں قیام رہا۔ مشایعت کے لئے سینکڑوں لوگ دہلی سے وہاں تک گئے۔ مفتی صدر الدین خان آزردہ نے حضرات ثلاثہ (حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب، جناب شاہ رفیع الدین صاحب اور جناب شاہ عبدالقادر صاحب) سے تحصیل علم کی تھی۔ حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کے حلقہ شاگردی میں بھی رہے تھے، لیکن ان میں سے کسی بزرگ سے سند نہیں لے سکے تھے۔ نظام الدین میں مفتی

صاحب نے حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب سے سند کے لئے عرض کیا تو انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔اب مفتی صاحب نے میاں سید نذیر حسین صاحب سے کہا کہ آپ ان سے میرے لئے سند کی درخواست کریں۔ نماز ظہر کے بعد میاں صاحب نے شاہ صاحب سے عرض کیا کہ حضور آپ مفتی صدر الدین کو سند عنایت فرمادیں، لیکن حضرت شاہ صاحب نے پھر بھی کوئی جواب نہیں دیا۔دوسرے روز صبح کے بعد پھر میاں صاحب نے عرض کی کہ مفتی صاحب کی کم نصیبی ہے کہ حضرات ثلاثہ سے سند نہ لی،اب حضور بھی تشریف لے جارہے ہیں اور انہیں سند نہ ملی۔اس پر حضرت شاہ صاحب نے سند لکھ دی اور میاں صاحب سے فرمایا کہ تم نے بھی تو سند نہیں لی ہے، تم بھی لے لو۔اب حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب نے خود سند تحریر فرما کر میاں صاحب کو عنایت فرمائی۔ پھر وہ تمام امور سے کٹ کر تدریسِ حدیث کی اس خدمت میں مصروف ہو گئے، جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو پیدا فرمایا تھا۔[11]

حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب نے میاں صاحب کو جو سند عطا فرمائی،اس کے الفاظ یہ ہیں:

بسم الله الرحمان الرحيم

الحمد لله رب العالمين والصلو ة والسلام على سيد المرسلين محمد واله واصحابه اجمعين۔اما بعد فيقول العبد الضعيف محمد اسحاق ان سيد النجيب المولوى محمد نذير حسين قد قراءعلى اطرافا من الصحاح الستته البخارى ومسلم وابى داودوالجامع الترمذى والنسائى و ابن ماجه وشيئا من كنز العمال والجامع الصغير وغيرهاوسمع منى الاحاديث الكثيرةفعليه ان يشتغل بقراءة ہٰذه الكتب ويتدرس بهالانه اهلها بالشروط المعتبرة عند اهل الحديث وانى حصلت القراءة والسماعة والاجازة لہٰذه الكتب من الشيخ الاجل الشيخ عبدالعزيز المحدث دہلوى وهو حصل القراءة والسماعة والاجازة عن الشيخ ولى الله محدث دہلوى رحمة الله عليهماوباق سنده مكتوبا عنده ۔حرره ثانى شهرشوال ١٢٥٨ الهجرية الحمدلله اولا و أخرا محمد اسحق ١٢٥٨ھ [١٢]

شمس العلماء کا خطاب

سید محمد نذیر حسین دہلویؒ کو جن مطاعن کا نشانہ بنایا گیا ان میں سے ایک طعنہ یہ بھی ہے کہ ان کو حکومت برطانیہ کی طرف سے ۱۲ محرم الحرام ۱۳۱۵ھ (۲۲ جون ۱۸۹۷ء) کو شمس العلماء کا خطاب ملا تھا۔ مولانا فضل حسین بہاری اس واقعہ کا تذکرہ یوں کرتے ہیں، کہ:

"شمس العلماء کے خطاب کا تذکرہ کوئی شخص میاں صاحب کے روبرو کرتا تو آپ نہایت ہی سادگی سے فرماتے کہ میاں خطاب سے کیا ہوتا ہے! ہمارے لیے تو پورا خطاب قرآن مجید میں حنیفا مسلما کا موجود ہے۔ دنیاوی خطاب سلاطین سے ملا کرتا ہے۔ یہ گویا ان کی خوشنودی کا اظہار ہے۔ مجھے کوئی نذیر کہے تو کیا اور شمس العلماء کہے تو کیا! میں نہایت خوش ہوں کہ ہر ایک میاں صاحب مجھے کہتا ہے، بھائی سادات کیلئے پیارا لفظ اس سے بڑھ کر نہیں ہے، اس لفظ کی برکات سے میری درویشانہ طرز میں فرق نہ آئے، بس خدا کا یہی فضل ہے۔"[13]

میاں صاحب کے مذکورہ الفاظ سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کے نزدیک اس خطاب کی کوئی وقعت نہیں تھی وہ درویشانہ زندگی میں ہی خوش و مسرور تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا سید نذیر حسین دہلویؒ کی عزت افزائی تو اس خطاب سے ہو ہی نہیں سکتی لیکن اس خطاب کو عزت و شرف اس نام کی برکت سے ضرور حاصل ہوا۔ حضرت میاں صاحب اپنی درویشانہ زندگی سے کس قدر مطمئن اور قانع تھے، درج ذیل واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

''نواب سکندر جہاں بیگم صاحبہ والیہ ریاست بھوپال اپنے مدار المہام منشی جمال الدین مرحوم کے ساتھ دہلی آئیں تو میاں صاحب سے عہدہ قضائے ریاست بھوپال قبول کرنے کی استدعا کی مگر آپ نے ملازمت سے قطعاانکار کر دیااور فرمایامیں تو وہاں کا قاضی القضاۃ ہو کر امیرانہ ٹھاٹھ سے مسند لگا کے حاکم بنا بیٹھا رہوں گا یہ غریب طلباء، چٹائی پر بیٹھنے والے مجھ کو کہاں ڈھونڈتے پھریں گے ؟یہ معنی ہے **اللھم احینی مسکیناً وامتنی مسکیناًواحشرنی فی زمرۃ المساکین** کے۔''[14]

میاں صاحب کے سوانح نگار مزید تحریر فرماتے ہیں کہ :

''جس وقت کمشنر دہلی نے بحکم لیفٹیننٹ گورنر پنجاب گورنمنٹ کی طرف سے اس خطاب کی خبر دی تو اس سے ایک منٹ پہلے تک میاں صاحب کے وہم و گمان میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ میں اس عام لقب سے ملقب ہوں گا۔''[15]

حضرت میاں صاحب کو جب خطاب ملا تو آپ نے فرمایا :

''خلعت و خطاب تو بڑے آدمیوں کو ملنا چاہیے، ہم کو دینا لاحاصل ہے۔''

میاں صاحب کے ان الفاظ پر مولانا نذیر احمد رحمانی یوں تبصرہ تحریر کرتے ہیں : میاں صاحب کا یہ فقرہ اپنی جگہ بڑا ذو معنی ہے، کہ ''ہم کو دینا لاحاصل ہے''یعنی خلعت و خطاب دے کر بڑے آدمیوں کو خریدا جاتا ہے اور موقع بموقع ان کو اپنے مقصد براری کیلئے استعمال کیا جاتا ہے اس لحاظ سے مجھ جیسے آدمی کو خلعت و خطاب دینا لاحاصل ہے۔[16]

رشتۂ ازدواج، اولاد واحفاد اور بھائی

میاں صاحب کے سوانح نگار مولانا فضل حسین بہاری کے بیان کے مطابق ۱۲۴۸ھ کے آغاز (۱۸۳۳ء) میں میاں صاحب کی شادی ہوئی تھی اور اسی سال کے آخر میں نو دس مہینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے بیٹا عطا فرمایا جس کا نام شریف حسین رکھا گیا۔[17]

یہ میاں صاحب کے اکلوتے بیٹے تھے۔ابتدا سے انتہا تک تمام تعلیم اپنے والد سے حاصل کی اور زندگی بھر لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رکھا۔ باپ کے پاس زیادہ رہنے کی وجہ سے معلومات کا دائرہ بہت وسیع تھا اور مسائل پر گہری نظر رکھتے تھے۔ میاں صاحب کی خدمت میں جتنے سوال آتے تھے بیشتر کے جوابات میاں شریف حسین ہی دیتے تھے۔کافی عرصہ طلبہ کو بھی پڑھاتے رہے۔خوش نویس تھے اور خط نستعلیق کے ماہر تھے۔[18] ۶ جمادی الاخریٰ ۱۳۰۴ھ کو باپ کے سامنے وفات پائی۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔[19]

میاں شریف حسین کے دو بیٹے اور چند بیٹیاں تھیں۔بیٹوں کے نام سید عبد السلام اور سید نور الحسن تھے۔میاں صاحب کی ایک صاحب زادی تھی، جن کی شادی میر شاہ جہاں سے ہوئی۔ صاحبزادی کی تین بیٹیاں تھیں اور ایک بیٹا تھا جس کا نام بدر الاسلام تھا۔دس گیارہ سال کی عمر میں وہ بھی وفات پا گیا۔ میاں صاحب اپنے نواسے سے بہت پیار کرتے تھے۔[20]

میاں صاحب کے دو بھائی تھے جو ان سے عمر میں چھوٹے تھے۔ منجھلے کا نام سید سجاد حسین تھا۔انہوں نے بڑی عمر میں قرآن حفظ کیا تھا۔ عابد و زاہد اور متقی بزرگ تھے۔دوسرے بھائی کا نام سید متوسل حسین تھا، یہ بھی بہت نیک تھے۔ یہ دونوں میاں صاحب سے پہلے فوت ہو گئے تھے۔[21]

تبحر علمی اور قوتِ حفظ

میاں صاحب تمام علوم متداولہ میں عمیق نگاہ رکھتے تھے، قرآن وحدیث، فقہ وکلام، صرف ونحو، اصول حدیث اور اصولِ فقہ، ادب وانشاء معانی وبیان، منطق وفلسفہ، حساب وریاضی غرض جو علوم اس زمانے میں مروّج ومتداول تھے، میاں صاحب کو ان سب میں عبور حاصل تھا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو حفظ واتقان کی بے پناہ دولت سے نوازا تھا، فقہ حنفی تو یوں سمجھئے کہ انھیں پوری طرح ازبر تھی اور کی تمام جزئیات ان کے خزانہ ذہن میں محفوظ تھیں، فتاویٰ عالمگیری کئی ضخیم جلدوں پر محیط ہے اور اسے حنفیہ کے تمام مسائل کے دائرۃ المعارف کی حیثیت حاصل ہے، میاں صاحب اس کے تمام گوشوں سے باخبر تھے، ان علومِ درسیہ ورسمیہ کے علاوہ انہیں اردو شعر اور عربی فارسی کے اشعار سے بھی دلچسپی تھی اور انہیں بہت سے شعرا کے بے شمار اشعار زبانی یاد تھے، وعظ وتبلیغ میں بھی منفرد اسلوب کے مالک تھے۔ فتویٰ نویسی میں نہایت محتاط تھے اور قرآن وحدیث اور ائمہ فقہ کے مستند حوالوں کی روشنی میں فتویٰ تحریر فرماتے تھے۔

درج ذیل واقعات سے حضرت میاں صاحب کی قوتِ حافظہ اور تبحر علمی کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا۔

''ایک روز حضرت شاہ صاحب کے حلقہ درس میں ترمذی شریف کا سبق ہو رہا تھا۔ اس سبق میں ایک جگہ کان محذوف تھا۔ شاہ صاحب نے شاگردوں سے پوچھا کہ کان کہاں کہاں محذوف ہوتا ہے؟ ماہرین علم نحو عام طور سے چار مقامات بیان کیا کرتے ہیں، جہاں کان کو محذوف مانا جاتا ہے۔ میاں صاحب نے ان معروف مواضع اربعہ کے ساتھ دو اور مقامات کا اضافہ کر کے بتادیا کہ فلاں فلاں محل میں بھی کان محذوف ہوتا ہے۔ اس طرح چھ مقامات میں لفظ کان کا حذف ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ شاہ محمد اسحاق علیہ الرحمۃ نے بھی اس کی تصویب اور تصدیق کی۔''[22]

حضرت حافظ عبدالمنان وزیر آبادی بیان کرتے ہیں کہ ایک دن صحیح بخاری کے سبق ''کتاب الاکراہ'' میں قال بعض الناس آیا۔ (امام بخاری نے التزام کیا ہے کہ وہ ان الفاظ میں امام ابو حنیفہ کے مذہب کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور اس کا مقصد ان کے نقطہ نظر کی تردید ہوتا ہے۔) علامہ عینی حنفی شارح صحیح بخاری نے جو اپنے مذہب کے سرگرم حامی ہیں، صحیح بخاری کے ہر ایسے مقام پر لکھا ہے کہ یہ ہمارا مذہب ہی نہیں، میاں صاحب نے حافظ عبدالمنان وزیر آبادی کے یہ الفاظ سنے تو اثنائے سبق ہی میں اٹھ کر گھر تشریف لے گئے اور قلمی کتابوں کی نو جلدیں ایک گٹھڑی میں باندھ لائے اور معتبر حوالوں سے ثابت کیا کہ حنفی مذہب کا وہی مسئلہ ہے جو امام بخاری نے لکھا ہے اور علامہ عینی کو خود اپنے مذہب کا علم نہیں۔[23]

ان واقعات سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے، کہ میاں صاحبؒ علوم متداولہ میں گہری نظر رکھتے تھے اور گرانقدر قوت حافظہ کے مالک تھے۔

خاندان شاہ ولی اللہی کے جانشین۔۔۔میاں نذیر حسین دہلوی

تدریس علومِ حدیث میں خانوادہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے اصل وارث حضرت میاں سید نذیر حسینؒ ہی تھے، کیونکہ:

شوال ۱۲۵۸ھ میں حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب نے ہندوستان سے ہجرت فرمائی، اس وقت دہلی میں بے شمار علمائے کرام موجود تھے، جن میں اکثر حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے تلامذہ اور تربیت یافتہ تھے، ان کے درس وتدریس کے حلقے بھی قائم تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے بھتیجے اور شاہ رفیع الدین کے بیٹے شاہ مخصوص اللہ بھی موجود تھے جو پچیس برس تک شاہ عبدالعزیز

صاحب کے حلقہ درس میں شریک رہے تھے اور عرصہ دراز تک خود بھی مشغولِ تدریسِ حدیث رہے تھے، شاہ مخصوص اللہ صاحب کے چھوٹے بھائی شاہ محمد موسیٰ صاحب بھی زندہ تھے اور اپنا ایک علمی اور خاندانی مقام رکھتے تھے، پھر شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ محمد اسحاق صاحب کے مشاہیر تلامذہ بھی دہلی اور بلادِ ہند کے مختلف اطراف میں پھیلے ہوئے تھے جو وعظ وارشاد اور درس وافتا کی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ لیکن حضرت شاہ عبدالعزیز اور حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب کی مسند درس وافتا پر حضرت میاں سید نذیر حسین ہی متمکن ہوئے۔ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ ''میاں صاحب'' کا لقب اس زمانے میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کے خاندان کے لیے مخصوص تھا، پہلے شاہ عبدالعزیزؒ صاحب کو میاں صاحب کہا جاتا تھا۔ بعد ازاں ان کے جانشین حضرت شاہ محمد اسحاقؒ صاحب کو میاں صاحب کہا جانے لگا، پھر بہ سلسلہ جانشینی ان سے منتقل ہوتا ہوا یہ لقب حضرت سید نذیر حسینؒ صاحب تک پہنچا اور ان کی ذاتِ گرامی پر اس طرح چسپاں ہوا کہ میاں صاحب اور سید نذیر حسین گویا دو مترادف لفظ قرار پا گئے۔ جوں ہی علمی اور تدریسی حلقے سے تعلق رکھنے والے کسی شخص کی زبان سے میاں صاحب کا لفظ ادا ہوا فوراً ذہن سید نذیر حسین کی طرف منتقل ہو گیا۔

سیاسی زندگی

میاں صاحبؒ کو سیاسی اعتبار سے الزامات لگا کر داغدار کرنے کی کوشش کی گئی، آئندہ سطور میں میاں صاحب پر لگائے گئے الزامات کا جائزہ اور سیاسی زندگی کے ضمن میں آنے والے دیگر امور کا بھی تذکرہ کیا جائے گا۔

انگریز سے وفاداری کا الزام۔۔۔!

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی یا جسے زمانہ غدر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس میں مقتدر اور معمولی مولویوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتوی دیا تو میاں صاحب ان علماء میں سے تھے جنھوں نے اسے عام بلوا کی حیثیت دی، جس کی شریعت بالکل اجازت نہیں دیتی ہے۔ لہٰذا فتوی پر دستخط اور مہر نہ کی۔ میاں صاحب فرماتے تھے کہ ''میاں وہ ہلڑ تھا۔ بہادر شاہی نہ تھی، وہ بیچارہ بوڑھا بہادر شاہ کیا کرتا، حشرات الارض خانہ برانداز وں نے تمام دہلی کو خراب، ویران، تباہ اور برباد کر دیا۔ شرائط امارت وجہاد بالکل مفقود تھے۔ ہم نے اس فتوی پر دستخط نہیں کیا، مہر کیا کرتے اور کیا لکھتے۔''[24]

میاں صاحب کی انگریزوں کے ساتھ وفاداری بالکل ثابت نہیں ہوتی بلکہ یہ تو بغیر کسی لگاؤ لپٹ کے اصل صورتحال کا اظہار ہے۔ مزید یہ کہ یہ ایک اجتہادی مسئلہ تھا۔ ایک گروہ نے ایک نقطہ نگاہ سے غور کیا اور دوسرے نے دوسرا نقطہ نگاہ پیش نظر رکھا اب جس گروہ نے شرائط و امارت وجہاد کو مفقود قرار دیا ان پر وفاداری کا الزام شریعت کی روح کے منافی ہے۔ لہٰذا میاں صاحب پر یہ الزام بے بنیاد ہے۔

مس لیسنس کا قصہ

مس لیسنس کا قصہ بھی وفاداری ثابت کرنے کے ضمن میں پیش کیا جاتا ہے۔ جس کو میاں صاحب اس طرح بیان کرتے ہیں کہ:

''میں اس زمانے میں ایک دن نماز عصر کے بعد شہر سے باہر چلا گیا، ملا محمد صدیق پشاوری جو اس وقت مجھ سے اصول فقہ پڑھتا تھا، میرے ساتھ تھا۔ مجھ کو کسی آدمی کے کراہنے کی آواز سنائی دی، میں اس آواز کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچا تو دیکھا کہ ایک میم مجروح ہے اور رو رہی ہے۔ ہمیں دیکھ کر کہنے لگی کہ خدا کے واسطے میری جان مت مارو۔ میں نے اس کو دلاسا دے کر کہا کہ ہم مسلمان ہیں اور ہمارے مذہب

میں لڑائی کے وقت بھی کسی غنیم کی عورت بچوں کی جان مارنا یا انھیں تکلیف دینا حرام ہے۔ تم اپنی جان کے متعلق پوری طرح اطمینان رکھو،اور اگر تمھاری مرضی ہو تو ہم تم کو اپنے گھر لے چلیں اور تمھارے زخم کا علاج اور تیار داری کریں۔ مگر چونکہ وہ بہت ڈری ہوئی تھی، کہنے لگی اول تو ہم اپنے پاؤں سے چل نہیں سکتے اور تم لوگ اگر اٹھا کر لے بھی چلو تو باغیوں کی گولی سے بچ نہیں سکتے۔ میں نے کہا ہم لوگ تم سے کچھ دور ٹھہرتے ہیں، رات کو اندھیرے میں تم کو اٹھا کر لے چلیں گے۔ آخر یہی ہوا کہ اندھیرے میں ہم اور ملا صدیق اٹھا کر اس کو ایسے راستے سے لائے کی کسی فرد بشر کو اس کی خبر بھی نہ ہوئی۔ گھر میں جا کر شریف حسین کی ماں سے کہا کہ یہ نہایت مظلومہ ہے۔اس کی بہت دلجوئی اور خدمت کرنی چاہیے کہ موجب خوشنودی خدا اور رسول ہے۔ موسم سخت گرمی کا تھا اور وہ دن رات ایک کوٹھڑی میں بند رہتی۔ ہر چند میری اہلیہ اس کو کہتیں کہ رات کو انگنائی میں آکر بیٹھو وہ ڈر سے کوٹھری سے باہر نہ آتی اور اسی گرمی اور مچھروں کی تکلیف میں رات بھر ہاتھ اٹھائے دعا کرتی کہ اے اللہ میرا قصور معاف کر۔"[25]

اس قصہ میں بھی میاں صاحب نے شریعت کے اصولوں کی پیروی کی ہے۔ کہ دوران جنگ عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو قتل نہ کیا جائے۔ دنیوی منفعت بالکل بھی مقصود نہ ہے۔ علاوہ ازیں جو مختلف اسناد مختلف مواقع پر انگریزوں کی طرف سے دی گئیں انھیں بھی وفاداری ثابت کرنے کیلئے پیش کرنا ایک عبث اور بے سود مشق ہے۔ شدید الزام کیلئے یہ دلیلیں ہر گز کافی نہیں ہو سکتیں۔

راولپنڈی جیل میں قید

۱۸۶۴ء اور اس کے بعد انگریزی حکومت کی بغاوت کے سلسلے میں مولانا احمد اللہ، مولانا یحییٰ علی اور مولانا محمد جعفر تھانیسری وغیرہ حضرات پر انبالہ، پٹنہ اور دیگر شہروں میں حکومت نے جو مقدمے بنائے ان میں میں انگریزی حکومت نے حضرت میاں صاحب کو بھی گرفتار کر لیا۔اور دہلی سے سات آٹھ سو میل دور راولپنڈی جیل میں قید کر دیا گیا۔ تقریبا ایک سال وہ راولپنڈی جیل میں قید رہے اور پھر راولپنڈی سے مزید تحقیق کیلئے پشاور بھیجا گیا، جہاں ایک انگریز چیمبر لین نے تحقیق کرنا تھی، اس کے بعد پھر راولپنڈی لائے گئے۔ اسی اثنا میں چیمبر لین وفات پا گیا، قید کے زمانے میں میاں صاحب کو راولپنڈی کے سرکاری کتب خانے سے کتابیں منگوانے اور ان کا مطالعہ کرنے اجازت مل گئی تھی، ایک طالب علم عطاء اللہ نے جیل میں حضرت میاں صاحب سے صحیح بخاری پڑھی اور قرآن مجید حفظ کیا، اور ایک شخص جس کا نام میر عبد الغنی تھا جو میاں صاحب کے آبائی وطن سورج گڑھ کا رہنے والا تھا اس نے جیل میں وفات پائی، میاں صاحب نے خود اس کی تجہیز و تکفین کی اور نماز جنازہ پڑھائی۔ ۱۴ رمضان المبارک ۱۲۸۷ھ کو جمعرات کے دن میاں صاحب کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہوا۔[26]

میاں صاحب کے سیرت و کردار پر ایک نظر

میاں صاحب کے سوانح نگار مولوی فضل حسین بہاری نے اپنی کتاب الحیاۃ بعد المماۃ کے باب چہارم اور باب پنجم میں ان کے اخلاق و عادات پر تفصیلا بحث کی ہے۔ ذیل کی سطور انہی دو ابواب سے اخذ کر کے انتہائی اختصار کے ساتھ قلمبند کی گئی ہیں۔

میاں صاحب مجد دوقت اور پیکر حسنات تھے، سوائے تین چار گھنٹوں کے جو نیند کی حالت میں گزرتے تھے بمشکل کسی ایسے وقت کی نشاندہی کی جاسکتی ہے کی آپ باوضو نہ ہوں، خدمت خلق کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ بارش ہو گرمی ہو یا سردی ہر طرح کے موسم میں لوگوں کی خدمت کیلئے تیار رہتے۔ بازار سے لوگوں کی چیزیں خرید لاتے۔ رمضان میں سحری کے وقت بالخصوص طلبہ کیلئے بر

وقت کھانا پہنچانے کا اہتمام فرماتے۔ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی کی اس کے بیٹے، بیٹی یا رشتے دار کا نکاح میاں صاحب پڑھائیں۔لوگوں کی غمی وشادی میں شرکت فرماتے۔اپنے مخالفین کے ساتھ عفوودرگزر سے کام لیتے حتی کہ ایک شخص جو آپ کو ایذا رسانی کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا اس نے سفارش کیلئے نواب رامپوری کے نام خط لکھنے کا کہا بلا تامل لکھ دیا۔جس سے اس کا کام بھی ہو گیا۔ایثار وقربانی کے جذبے سے بھی انتہا درجے متصف تھے،ایک دفعہ تین دن اور تین راتیں مسلسل فاقے سے گزارے اور اپنے حصہ کا کھانا مہمان کو کھلاتے رہے اور اس سے نہ پابندی اوقات میں فرق آیا اور نہ عام معمولات میں کمی بیشی ہوئی۔سخاوت وجودت کا جذبہ بھی بے حد تھا،حاجت مندوں کی اعانت چپکے سے کرتے،سادگی کا یہ حال تھا کہ زیادہ تر سرکے سے ساتھ روٹی کھاتے یا فقط ستو پر اکتفا کرتے یا شہد کے ساتھ روٹی کھالیتے اور کبھی بنے ہوئے چنوں پر بھی گزارا کر لیتے۔آپ بے حد متحمل مزاج اور حلیم الطبع تھے،سفر حج سے واپسی پر لوگوں کے استقبالیہ ہجوم میں ایک شخص نے مصافحہ اور دست بوسی کے بہانے ہاتھ کے انگوٹھے پر اس قدر زور سے دانت کاٹا کہ خون جاری ہو گیا،میاں صاحب نے انگوٹھا اپنی چادر میں چھپالیا اور اسے کچھ نہ کہا،راولپنڈی کی قید کے زمانہ میں کہ جہاں ہر روز پھانسی کی دھمکی دی جاتی تھی وہاں نہایت اطمینان سے مطالعہ کتب جاری رہا اور ایک طالب علم کو مکمل صحیح بخاری پڑھائی اور حج بیت اللہ کے موقع پر بھی جب آپ کے قتل کے منصوبے بنائے جارہے تھے تو آپ بالکل بھی نہ گھبرائے اور وعظ جاری رکھا،حیات مستعار کے آخری دور میں ضیق النفس کا مرض کا لاحق ہو گیا، لیکن تدریس قرآن وحدیث ہی دراصل اس بیماری کی دوا اور غذا تھی۔غیر اہلحدیث سے بھی مخلصانہ مراسم رکھتے تھے،فتوی نویسی کا کوئی صلہ یا پیسہ نہیں لیتے تھے بلکہ ایسے لوگوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے جنھوں نے فتوی نویسی کو کسب معاش کا ذریعہ بنایا ہوا تھا۔محلے دار آپ کے پاس کوئی نقدی یا زیورات امانت کے طور پر رکھتے تو آپ اس میں خیانت نہ کرتے،اساتذہ کرام اور ان کی اولاد کا بھی احترام کرتے،اگر کوئی شخص میاں صاحب کی تنقیص کرتا تو اس سے انتقام نہ لیتے،نہایت ظریف الطبع اور خوش مزاج تھے ،دوران درس ہنسی مزاح سے بھی کام لیتے،وضع قطع میں انتہائی سادہ تھے،ٹاٹ پر بیٹھ کر پڑھانے میں عار محسوس نہ کرتے ہزاروں عربی فارسی اور اردو کے شعر زبانی یاد تھے۔الغرض میاں صاحب کی زندگی تمام اخلاق کریمانہ سے عبارت تھی۔[27]

میاں صاحب کے سوانح نگار نے عنوان ضمیمہ اول کے تحت میاں صاحب کی تصانیف کی فہرست دی ہے اور لکھا ہے ''میاں صاحب کی تصنیف وتالیف کی صحیح تعداد تو غالبا کوئی شخص نہیں بتا سکتا،وفات سے ستائیس برس پہلے انھوں نے فرمایا تھا کی اگر میرے کل فتاوی کی نقل رکھی جاتی تو چار فتاوی عالمگیری کے برابر ہوتیں،اس کے بعد خدا جانے اس ستائیس برس میں کس قدر فتوے لکھے''۔تاہم سوانح نگار نے کچھ مطبوعہ تالیفات کے نام لکھے ہیں جن میں چھوٹے بڑے رسائل اور فتوے بھی شامل ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ آپ کی تالیفات کے مقابل میں ''اندکہ از بسیار بلکہ یکے از ہزار کی نسبت رکھتے ہیں۔''اس کے بعد فاضل سوانح نگار نے چند مطبوعہ رسائل وکتب کے نام درج کیے ہیں جو ذیل میں تحریر کیے جارہے ہیں۔

ا۔الایمان یزید وینقص، ۲۔جواز ہبہ مشاع، ۳۔پیری مریدی، ۴۔سماع وغنا ومزامیر، ۵۔اذان ثالث، ۶۔توثیق عبادہ بن صامت در قراءت فاتحہ خلف امام، ۷۔تراویح سنت موکدہ، ۸۔تحقیق حدیث جابر بن سمرہ در باب رفع الیدین، ۹۔تحقیق رجس انما الخمر والمیسر۔۔۔۔الآیۃ، ۱۰۔مولانا اسماعیل شہید اور سید احمد شہید علیہما الرحمۃ قابل تعظیم تھے، ۱۱۔سبع ارضین، ۱۲۔لفظ ما کی تحقیق نسبت ما

اھل لغیر اللہ، ۱۳۔ جمع بین الاختین کی تردید، ۱۴۔ جواب جانور منذور لغیر اللہ، ۱۵۔ مسئلہ استواء، ۱۶۔ تقویۃ الایمان (مصنفہ مولانا اسماعیل شہید) کی توثیق، ۱۷۔ دیہات میں جمعہ کی نماز، ۱۸۔ تحقیق اشارہ ما تقول لہذا الرجل، ۱۹۔ سوال منکر نکیر، ۲۰۔ دیدار الٰہی بعین البصر اولیاء اللہ اور دنیا می شودیانہ، ۲۱۔ طلاق مشروع، ۲۲۔ چلتی ہوئی ریل گاڑی میں نماز، ۲۳۔ ناجوازی عبادت شاقہ، ۲۴۔ تقسیم بدعات، ۲۵۔ قراءت فاتحہ خلف الامام کی تحقیق بحوالہ محلیٰ شرح موطا شیخ سلام اللہ حنفی، ۲۶۔ عمل حرمین حجتہ شرعیہ نہیں، ۲۷۔ حدیث اعلان نکاح من وجہ ضعیف، ۲۸۔ ہنڈوی پر زکوۃ نہیں، ۲۹۔ تحقیق خروج بضعۃ، ۳۰۔ حرمت نفع بذریعہ قرض، ۳۱۔ انتقال مسجد، ۳۲۔ فضائل مکہ معظمہ و مدینہ منورہ، ۳۳۔ مکہ معظمہ میں چار مصلے، ۳۴۔ مجلس میلاد اور قیام، ۳۵۔ مصرف مال زکوۃ، ۳۶۔ الشرط من الجانبین، ۳۷۔ حدیث شرط ابوداؤد، ۳۸۔ نیچری، ۳۹۔ قدم رسول ﷺ، ۴۰۔ حدیث مصراط، ۴۱۔ اذا اقیمت الصلوۃ، ۴۲۔ افضل البضاعۃ فی حقیقۃ الشفاعۃ، ۴۳۔ جواب چند مسائل مال تجارت زکوۃ شحم خنزیر وغیرہ، ۴۴۔ قنوت نازلہ، ۴۵۔ مسائل اربعہ، ۴۶۔ دلیل محکم فی نفی اثر القدم، ۴۷۔ تعزیہ پرستی، ۴۸۔ گیارہ سوالات کے جوابات، ۴۹۔ زیور، ۵۰۔ ثبوت الحق الحقیق، ۵۱۔ واقعۃ الفتوی، ۵۲۔ دافعۃ البلوی (رد تقلید)، ۵۳۔ واقعۃ الفتوی در بیان ادائے سنت فجر، ۵۴۔ فلاح الولی باتباع النبی، ۵۵۔ معیار الحق، ۵۶۔ قبالہ۔[28]

معیار الحق

حضرت میاں صاحب کی ایک اہم تصنیف ''معیار الحق'' ہے جو مقدمہ سمیت ۴۹۰ صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کا ایک خاص پس منظر ہے، بات یہ ہے کہ مولانا اسماعیل شہید کی تصانیف میں سے دو کتابیں اہم ہیں۔

ان میں سے ایک کتاب ''نور العینین فی اثبات رفع الیدین'' ہے۔ یہ کتاب عربی زبان میں ہے۔ مولانا اسماعیل شہید نے اس میں وہ احادیث رسول ﷺ جمع فرمادی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز میں رفع الیدین کرنا سنت ہے اور نبی ﷺ رفع الیدین کیا کرتے تھے۔ دوسری کتاب ''ایضاح الحق الصریح فی احکام المیت والضریح'' ہے۔ یہ کتاب فارسی زبان میں ہے اور اپنے موضوع کی معرکۃ آرا کتاب ہے۔ ان کتابوں کے جواب میں ایک عالم دین مولوی محمد شاہ پنجابی نے ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۳ء) میں ''تنویر الحق'' کے نام سے کتاب لکھی۔ مولوی محمد شاہ پنجابی موجودہ جغرافیائی لحاظ سے پاک پتن کے ایک گاؤں پیر سکندرہ کے باشندہ تھے اور چار سال حضرت میاں صاحب کے حلقہ شاگردی میں رہے تھے، اس لیے انہوں نے اس دور کے معروف عالم دین مولانا نواب قطب الدین کے نام سے ان کی منت سماجت کر کے ان کے نام سے کتاب چھپوادی۔

میاں صاحب کو یہ کتاب پہنچی تو انہوں نے کتاب کی زبان اور اسلوب تحریر کو دیکھ کر فرمایا کہ یہ کتاب نواب قطب الدین کی تصنیف نہیں ہے، بلکہ محمد شاہ پنجابی کی تصنیف ہے۔

میاں صاحب نے اس کتاب کے جواب میں ''معیار الحق'' لکھی۔ میاں صاحب کی تصنیف ''معیار الحق'' کے جواب میں مولانا ارشاد حسین رام پوری نے ''انتصار الحق'' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ پھر ''انتصار الحق'' کے جواب میں میاں صاحب کے چار شاگردوں نے علیحدہ علیحدہ کتابیں لکھیں۔ وہ کتابیں یہ ہیں:

۱۔ براہین اثناء عشر ۲۔ تلخیص الانظار فی ما بنی علیہ الانتصار ۳۔اختیار الحق ۴۔ بحر ذخار

فتاوٰی نذیریہ

فتاوٰی نذیریہ میاں صاحب کے ان فتاوٰی پر مشتمل ہے جو میاں صاحب نے مختلف اوقات میں مختلف مسائل کے بارے میں دیے۔ میاں صاحب کے ان فتاوٰی کو پہلے پہل تحریر میں لائے جانے کا بندوبست نہیں تھا،اس حقیقت کے بارے میں میاں صاحب اپنی وفات سے ۲۷ سال پہلے عندالتذکرہ فرمایا"اگر میرے سارے فتاوٰی کی نقل رکھی جاتی تو کم سے کم چار فتاوٰی عالمگیری کے برابر تو ہوتی مگر پہلے کسی نے اس کا خیال نہیں رکھا اب میاں شریف حسین اس کی نقل رکھنے لگے ہیں۔"[29] میاں صاحب کی زندگی میں ان فتاوٰی کو کتابی شکل نہ دی گئی، بلکہ میاں صاحب کی وفات کے بعد ۱۹۱۳ء میں فتاوٰی کو کتابی شکل دے کر، میاں صاحب کے نام سے ہی، جیسا کہ مولانا فضل حسین بہاری نے بھی اظہار کیا تھا کہ کوئی میاں صاحب کے فتاوٰی کو جمع کر کے فتاوٰی نذیری نام رکھ دے، نام رکھا گیا۔[30]

حضرت میاں صاحب کے فتاوٰی بہترین علمی و تحقیقی نکات پر مشتمل ہیں۔ یہ فتاوٰی آپ کے تین خاص تلامذہ صاحب عون المعبود فی شرح ابی داود، مولانا شمس الحق ڈیانوی عظیم آبادی (م:۱۳۲۹ھ)، صاحب تحفۃ الاحوذی فی شرح جامع ترمذی، مولانا عبدالرحمان مبارکپوری (م:۱۳۵۳ھ) کی مساعی حسنہ اور صاحب تنقیح الرواۃ فی شرح مشکوۃ مولانا ابوسعید شرف الدین محدث دہلوی (م:۱۳۸۱ھ) کی تحقیق و مختصر تعلیقات کے ساتھ ۱۳۳۳ھ/۱۹۱۳ء میں دو جلدوں میں شائع ہوئے، یہ فتاوٰی کافی عرصہ سے نایاب تھے۔ ۱۳۹۰ھ میں شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفی (م:۱۳۸۷ھ) اور مولانا عطاءاللہ حنیف بھوجیانی (م:۱۹۸۷ء) کی مساعی جمیلہ سے اہلحدیث اکادمی لاہور کے زیر اہتمام تین جلدوں میں شائع ہوئے، اسی طرح ۲۰۱۰ء میں اس کی تیسری اشاعت اہلحدیث اکادمی لاہور کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔ان فتاوٰی میں غیر منصوص مسائل کے جواب میں بکثرت فقہ حنفی کی کتب ہدایہ، فتاوٰی عالمگیری اور فتاوٰی شامی کے حوالے ہیں جو میاں صاحب کے امین و معتدل ہونے پر شاہد عدل ہیں۔

فتاوٰی نذیریہ کی جلد اول میں ۲۷۸ فتاوٰی[31] جلد دوم میں ۳۷۹ فتاوٰی[32] جلد سوم میں ۲۸۵ فتاوٰی،[33] کل میزان ۹۴۲ فتاوٰی ہیں۔

تدریسی خدمات

علم حدیث کی شہرت تدریس

علم حدیث کی تدریس کے سلسلے میں میاں صاحب کی شہرت مختلف اقطار عالم میں پھیلی ہوئی تھی اور دنیا کے بہت سے حصوں میں ان کے تلامذہ موجود تھے۔ ہندوستان کے تقریباً ہر ضلع، ہر شہر اور ہر قصبے میں ان کے فیض یافتگان خدمت علم حدیث میں مشغول تھے۔ متعدد دیہات میں بھی ان کی مساند تدریس آراستہ تھیں، اس کے علاوہ بیرون ہند کے بہت سے ممالک میں ان کے مستفیدین اچھی خاصی تعداد میں قال اللہ اور قال الرسول کی دل نواز صدائیں بلند کر رہے تھے۔ مثلاً حجاز، مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، یمن، شام، نجد، حبش، افریقہ، تیونس، الجزائر، کابل، غزنی، قندھار، سمرقند، بلخ، بخارا، داغستان، ایشیائے کوچک، ایران، مشہد، خراسان، ہرات، چین، کوچین، برہما، سری لنکا، وغیرہ ملکوں اور علاقوں میں حضرت میاں صاحب کے شاگرد موجود تھے اور ان کے درس و تدریس کے حلقے قائم

تھے، ملک حجاز میں بالخصوص حضرت میاں صاحب کی خدمت حدیث کا بہت چرچا تھا۔اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ میاں صاحب کو فریضہ حج کی ادائیگی کے دوران ان کے بعض مخالفین نے حکومت کے بعض سرکردہ افراد کو ان کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی تو اس کا علم وہاں کے شیوخ اور مشاہیر اہل علم کو ہوا تو ان کا شدید ردعمل سامنے آیا۔ جس کا ذکر مولانا تلطف حسینؒ نے کیا ہے۔"[34]

منہج تدریس

صاحب الحیاۃ بعد المماۃ میاں صاحب کے درس وتدریس کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں کہ چند باتیں آپ کے درس میں قابل لحاظ تھی، اقوالِ صحیحہ وضعیفہ کی جانچ پڑتال، سلجھی ہوئی تقریر، بیان کی صفائی، تفہیم کی قدرت، حافظے کی قوت، اشکال کی تشریح، وسعت نظر، ملکہ راسخہ، ہر مقام کے مالہ وماعلیہ سے وقوف۔[35]

ڈپٹی نذیر احمد لکھتے ہیں: ''آپ کا درس عام پسند اور حساد کے لیے موجب گزند تھا۔''[36]

مولوی محمد عبداللہ بازید پوری فرماتے ہیں کہ فقہ و تفسیر، حدیث اور فلسفہ کے آپ عالم متبحر تھے۔پڑھانے میں جب تقریر کرتے تو ایک بحر موّاج معلوم ہوتے تھے۔[37]

عام لوگوں کے لیے میاں صاحب صبح کے وقت قرآنِ مجید کا درس دیا کرتے تھے۔درس کا سلسلہ روزانہ چلتا تھا۔ایک رکوع قرآن مجید کا تلاوت فرماتے اور پھر اس کا ترجمہ کرتے، اندازِ بیان نہایت سادہ ہوتا، اس طرح ایک قرآن سال میں ختم ہوتا۔[38]

قرآن میں جہاں اللہ کی توحید کا مضمون آتا، اسے سلجھا کر فرماتے:

''مگر تم دلی والے یا پیر یا پیر ہی کہتے رہنا۔ماقدروا اللہ حق قدرہ۔چلو، صاحب چلو۔۔۔''[39]

سامعین میں اگر علمائے کرام بھی موجود ہوتے تو ان کے لیے مسائل الٰہیات و فلسفہ کے بعض نکات و غوامض بھی بیان فرما دیتے۔تقریر میں ایسی صفائی اور سادگی ہوتی کہ بمصداق آنچہ از دل خیزد و در دل ریزد کے محاورے کے مطابق ہر بات لوحِ قلب پر مرتسم ہوتی چلی جاتی۔[40]

تلامذہ ومعتقدین کی تعداد

مولانا سید عبدالحیٔ حسنی تلامذہ کی کثرت پر لکھتے ہیں:

واما تلامذته فعلى طبقات: منهم العالمون، الناقدون، المعروفون، فلعلهم يبلغون الف نفس و منهم المقاربون بالطبقة الاولىٰ فى بعض الاوصاف ومنهم من يلى الطبقة الثانيه وواهل هٰذين الطبقتين يبلغون الى الالاف[41]

جناب مولوی تلطف حسینؒ فرماتے ہیں کہ جب طلبہ کے کھانے کا انتظام میرے ذمہ تھا، اس وقت میں نے ایک رجسٹر بنایا تھا اور تین برس تک لکھنے کا انتظام کیا، اس رجسٹر میں بارہ ہزار طلبہ کے نام درج ہوئے تھے۔پھر میں اپنی مصروفیات کے باعث وقت نہیں نکال پایا۔[42]

حافظ محمد حسین ضریر البصر کے مطابق جب میں دہلی میں میاں صاحب سے پڑھنے کے لیے گیا تو میرا نمبر بارہ ہزار تھا اس کے علاوہ نمبر شمار کا ایک اور رجسٹر بھی تھا۔[43] دعویٰ کے ساتھ شاگردوں کی مکمل تعداد بتانا تو ممکن نہیں، لیکن یہ اندازہ کسی قدر صحیح معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کے شاگردوں کی تعداد کم سے کم بیس ہزار ہے اور معتقدین کی تعداد 8 لاکھ تک بیان کی جاتی ہے۔[44]

بیماری اور ذکر و اذکار

وفات سے دس بارہ سال پہلے میاں صاحب کے گھٹنوں میں درد ہونے لگا تھا، اس لیے ہاتھ میں چھڑی رکھنے لگے تھے اور مسجد میں زیادہ تر ڈولی میں تشریف لاتے تھے۔ پھر وفات سے نو دس مہینے قبل تکلیف بڑھ گئی اور صاحب فراش ہو گئے۔[45]

حضرت کے داماد میر شاہ جہاں، بیٹیوں اور نواسیوں نے بیماری کے دنوں میں آپ کی بے حد خدمت کی۔ آپ نے اپنی صاحب زادی اور نواسیوں کو وصیت فرمائی کہ میرے مرنے کے بعد صبر کرنا اور یہ دعا کثرت سے پڑھنا: **اللھم اغفر له وارحمهُ**[46]

مولانا تلطف حسین کے بقول کسی دن ان سے ان کے مقام تدفین کے بارے میں پوچھا گیا اور بتایا گیا کہ جناب شاہ عبد العزیز کے مقبرہ میں بھی جگہ کا انتظام کیا جا چکا ہے تو جواب میں فرمایا: تم صرف اتنا کرنا کہ سنت کے مطابق مجھے اپنے ہاتھ سے غسل دینا اور اور کفن دینا۔ پھر بے شک اپنے گھر چلے جانا، اس کے بعد جس کے دل میں جو آئے ویسا کرے۔ اور یہ بھی فرمایا کہ ''اشد حباًللہ کا خیال رکھنا، باقی سب فضول اور بے کار ہے، سب کو دفع کرو۔''[47]

وفات اور تکفین وتدفین

مولانا تلطف حسین فرماتے ہیں ۱۰ رجب ۱۳۲۰ھ (۱۳ اکتوبر ۱۹۰۲ء) کو دوشنبہ کے دن مغرب کی اذان ہوئی، میں نماز کے لیے مسجد چلا گیا، واپس لوٹا تو معلوم ہوا کہ علم و فضل کا یہ نیر درخشاں غروب ہو چکا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کفن وغیرہ سب چیزیں پہلے سے موجود تھیں، وصیت کے مطابق فوراً غسل دے کے کفن پہنایا گیا اور میت کو چارپائی میں ڈال کر مسجد میں لایا گیا۔ اس وقت بے شمار لوگ مسجد میں موجود تھے۔ دوسرے دن سہ شنبہ کو نو بجے عید گاہ میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور قبرستان شیدی پورہ میں ان کے صاحب زادے مولانا شریف حسین کی قبر کے قریب اس عالم اجل کو دفن کیا گیا۔ اللھم اغفر له وارحمهُ وعافه واعف عنه[48] نماز جنازہ میاں صاحب کے پوتے سید عبد السلام نے پڑھائی۔[49]

بر صغیر میں جن شخصیات کا دائرہ اثر و نفوذ زمان و مکان کی محدودیت سے ماوراء ہے اور انھوں نے ایک مستقل فکر کی بنیاد رکھی، انہی شخصیات میں سے ایک میاں سید نذیر حسین دہلویؒ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ بر صغیر میں طبقہ اہل حدیث کی صحیح معنی میں بنیاد جس شخص نے رکھی وہ سید محترم ہی ہیں، ان کی فکر سے اختلاف ممکن ہی نہیں بلکہ تعبیر دین کی تنوع کا مظہر ہے مگر ان کی خدمات دینیہ سے انکار جادہ عدل سے ہٹا ہوا رویہ ہے۔ آج باشندگان بر صغیر اس علاقے میں بالخصوص اور پوری دنیا میں بالعموم جہاں جہاں اس مسلک سے وابستہ ہیں اور اس پر عامل ہیں، ان کا انتساب اسی شخصیت سے ہے۔

حواشی وحوالہ جات

[1]۔سورۃ الحجر۱۵: ۹۔

[2]۔بہاری، فضل حسین، **الحیاۃ بعد المماۃ**، المکتبہ اثریہ، سانگلہ ہل، شیخوپورہ، ۱۹۸۹ء، ص۱۵۔۱۶۔

[3]۔ایضاً ص۱۷۔۱۸۔

[4]۔ایضاً ص۲۳۔۲۴۔

[5]۔ایضاً ص۲۳۔۲۴۔

[6]۔ایضاً ص۲۴۔

[7]۔ایضاً ص۲۴۔۲۵۔

[8]۔ایضاً ص ۲۶۔۳۰۔

[9]۔نوشہروی، امام خان، ابو یحی، **تراجم علمائے حدیث ہند**، مکتبہ اہلحدیث ٹرسٹ کراچی، س۔ن، ۱/۱۳۶۔

[10]۔ایضاً ص۳۶۔۳۷۔

[11]۔ایضاً ص۴۴۔۴۵۔

[12]۔ایضاً ص۴۵۔

[13]۔بہاری، فضل حسین، **الحیاۃ بعد المماۃ**، ص۳۰۱۔

[14]۔ایضاً ص۳۰۱۔

[15]۔محولہ بالا۔

[16]۔رحمانی، نذیر احمد، مولانا، **اہلحدیث اور سیاست**، الترجمہ والتالیف، جامعہ سلفیہ مرکزی دار العلوم، بنارس، س۔ن، ص۴۱۲۔۴۱۳۔

[17]۔بہاری، **الحیاۃ بعد المماۃ**، ص۴۱۔

[18]۔ایضاً ص۲۷۷۔۲۷۸۔

[19]۔ایضاً ص۲۷۷۔

[20]۔ایضاً ص۲۷۸۔

[21]۔ایضاً ص۲۷۹۔

[22]۔ایضاً ص۵۲۔

[23]۔ایضاً ص۵۶۔

[24]۔ایضاً ص۷۶۔

[25]۔ایضاً ص۷۷۔۷۸۔

[26]۔ایضاً ص۸۱۔۸۳۔

[27]۔ایضاً ص۱۲۱۔۲۱۲

[28]۔ایضاً ص۲۸۱۔۲۸۲۔

[29]۔ایضاً ص۱۵۲۔

[30]۔ایضاً ص۱۵۲۔

[31]۔دہلوی، نذیر حسین، سید، **فتاوی نذیریہ**، جلداول

[32]۔ایضاً جلددوم

[33]۔ایضاً جلدسوم

[34]۔بہاری، **الحیاۃ بعد المماۃ**، ص۱۰۱۔

[35]۔محولہ بالا۔

[36]۔محولہ بالا۔

[37]۔ایضاً ص۷۰۔

[38]۔ایضاً ص۷۱۔

[39]۔محولہ بالا۔

[40]۔ایضاً ص۷۰۔۷۱۔

[41]۔الحسني، عبدالحي بن فخر الدين بن عبد العلي، الطالبي، **الإعلام بمن في تاريخ الهند من الأعلام** المسمى بہ **نزهة الخواطر وبهجة المسامع والنواظر** ۱۲۷۲/۸

[42]۔بہاری، فضل حسین، **الحیاۃ بعد المماۃ**، ص۳۵۵۔

[43]۔محولہ بالا۔

[44]۔محولہ بالا۔

[45]۔ایضاً ص۲۱۹۔

[46]۔ایضاً ص۲۲۰۔

[47]۔ایضاً ص۲۲۱۔

[48]۔ایضاً ص۲۲۲۔

[49]۔ایضاً ص۲۳۲۔۲۳۳۔